OPEN ACCESS: http://theislamicculture.com

The Islamic Culture
Bi-Annual Research & Refereed Journal
Published by
Sheikh Zayed Islamic Centre,
University of Karachi
SZIC
الثقافة الإسلامية
ISSN (Print) : 1813-775X
ISSN (Online) : 2663-1709

سماج اور جدید انسانی رویوں میں تطابق: ایک عصری مطالعہ

Adaptation to society and human behaviors of modern age: A contemporary study

DR. MUHAMMAD RIAZ
Assistant Professor, Islamic Studies,
Department of Educational Development,
University of Baltistan Skarud, Baltistan

Dr. Sabir Ali
Lecturer, Educational Development
HoD Educational Development,
University of Baltistan Skarud, Baltistan

☆ڈاکٹر محمد ریاض
اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات، شعبہ ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ یونیورسٹی آف بلتستان سکردو، بلتستان

☆☆ڈاکٹر صابر علی
لیکچرار و ایچ او ڈی، شعبہ ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ یونیورسٹی آف بلتستان سکردو، بلتستان

Abstract:

The social animal is the discovery characteristic of man. Sociologists have long since discovered the secret that man is also an animal by nature. The most significant difference between this animal and that of other human beings is its ability to speak. However, in the thick of the veil of religious ideology, it has been evident from the beginning that man has two traits: one is that he possesses good qualities, and this trait is in fact his characteristic by which he can join the ranks of angels. Is. The second characteristic is man's bad deeds. He becomes so close to evil and wickedness that his basic identity, that is, humanity, is erased. At some point, he is also described as being worse than an animal. (In the language of the great Qur'an, Asfal Al-Safflin) Therefore, the people of our time are not free from these two attributes. We are human, but our humanity is manifested more by our character and good qualities than by our speech. We are beasts, but this beastliness

is reflected in our evil traits. However, it is also a fact that whether a person is a character or a narrator, in both cases he needs a society, he needs a collective life, he needs rules and regulations and guidance. Perhaps this is the reason why man before us Formed the society then formulated the state structure to maintain the collective form of that society. Titles such as government, state, kingdom, monarchy, monarchy, dictatorship, democracy and caliphate were introduced to save this particular body. The article in question explains society, especially Muslim society, and modern human attitudes, and examines human life, collective life, and general attitudes in detail.

Key Words: Society, man, attitudes, compatibility, modernity, Muslim society

معاشرتی حیوان، انسان کی کھوجی گئی وصفی شناخت ہے۔ علمِ عمرانیات کے ماہرین نے بہت پہلے یہ راز پالیا تھا کہ انسان اپنی ایک صفت یا خصلت کے اعتبار سے حیوان بھی ہے۔ دوسرے حیوانوں اور اس انسانی حیوان میں جو نمایاں فرق ہے وہ تکلم ہے یعنی یہ بول سکتا ہے اور نطق کی خاصیت رکھتا ہے۔ حالانکہ مذہبی نظریات کے دبیز پردوں میں یہ بات شروع سے نمایاں رہی ہے کہ انسان کی دو خصلتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ نیک صفات کا حامل ہے اور یہ خصلت دراصل اُس کی وصفی امتیاز ہے جس کے ذریعے وہ فرشتوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ دوسری خصلت میں انسان کے بُرے اعمال شامل ہیں۔ وہ بدی اور بُرائی سے اس قدر قربت پیدا کرتا ہے کہ اُس کی بنیادی شناخت یعنی انسانیت بھی مٹ جاتی ہے ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ حیوان سے بدتر وصف سے ملقب ہو جاتا ہے۔ (کلامِ عظیم قرآن کی زبان میں اسفل السافلین بن جاتا ہے) لہٰذا ہمارے زمانے کے انسان بھی انہی دو اوصاف سے مبرّا نہیں۔ ہم انسان ہیں لیکن ہماری انسانیت ہمارے نطق سے زیادہ ہمارے کردار اور اچھے اوصاف سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہم حیوان ہیں لیکن یہ حیوانیت ہماری بُری خصلتوں سے نظر آتی ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کرداری ہو یا نطقی (نطق) دونوں صورتوں میں ایک سوسائٹی کا محتاج ہے، اجتماعی رہن سہن کا محتاج ہے، اصول و قوانین اور رہنمائی کا محتاج ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم سے قبل کے انسان نے پہلے معاشرہ تشکیل دیا پھر اُس معاشرے کی اجتماعی ہیئت کو برقرار رکھنے کے لئے ریاستی ڈھانچہ وضع کیا۔ حکومت، ریاست، مملکت، بادشاہت، شہنشاہیت، آمریت، جمہوریت اور خلافت جیسے عنوانات اسی مخصوص ہیئت کو بچانے کے لئے معرضِ وجود میں لائے گئے۔ زیرِ بحث مقالہ کے ذریعے سماج خصوصاً مسلم معاشرہ اور جدید انسانی رویوں کی وضاحت کی گئی ہے اور انسان کے رہن سہن، اجتماعی زندگی اور عمومی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: سماج، انسان، رویئے، مطابقت، عصریات، مسلم سماج

طریقہ تحقیق:

یہ مقالہ قدیم وجدید منابع کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ خاص طور پر جدید حالات اور سماجی ساخت کو گہری فکر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ اِس بات کا خیال رکھنا ضروری سمجھا گیا کہ جہاں قدیمی منابع حوالہ کے طور پر مستعمل ہوں وہی جدید ٹیکنالوجی سے مزین آلات بھی زیرِ استفادہ رہیں۔ اِس سلسلے میں برقی اخبارات سے لے کر الیکٹرونک میڈیا کی تمام جُزئیات بھی مقالہ ہٰذا کی تکمیل میں معاون بنیں۔ چونکہ یہ مقالہ جدید افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور سماج کے گونا گوں مسائل خاص طور پر رویوں کی نشاندہی کرتا ہے اِس لئے مقالہ نگار خود شاہد کار ہے اور تجزیہ نگار ہے۔ لہٰذا اِس تناظر میں قرار دیا جاسکتا ہے کہ مقالہ ہٰذا کو مکمل کرنے کے لئے مشاہداتی وتجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ دیگر طرائقِ تحقیق اِس لئے مرکزِ نگاہ نہیں رہے کہ وہ ہماری دسترس سے دور تھے، دوسری بات یہ رہی کہ یہ مقالہ عامیانہ اُسلوب اور عامیانہ اذہان کی تشفی کے لئے ترتیب دیا گیا ہے لہٰذا اِس میں خواص کے اذہان وافکار کو صَرفِ نظر کرتے ہوئے صرف عوامی اذہان کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ لہٰذ تجزیہ وتحلیل جیسا عنصر اِس مقالہ کی تکمیل میں بھرپور معاون بنا۔

اظہارِ تشکر:

یہ مقالہ اسٹارٹ اَپ ریسرچ گرانٹ بلتستان یونیورسٹی سکردو کی معاونت سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلے میں متعلقہ ذمہ داروں اور جامعہ ہٰذا کی انتظامیہ کا شکریہ ادانہ کرنا غفلت ہوگی۔ مقالہ نگار اُن تمام افراد کا تہہ دل سے مشکور ہے جنھوں نے مقالہ ہٰذا کی تکمیل سے لے کر اشاعت تک تعاون کیا اور بھرپور حوصلہ افزائی کے ذریعے اپنی دلچسپی کا اِظہار کیا۔

مقدمہ:

منطقی سوال ہے کہ جدید سماج میں انسانی رویوں کی نشاندہی کیسے ہو؟ ایک طرف قدامت پرستی کے آثار واضح ہیں تو دوسری طرف بدلتا ہوا سماج کہ جس میں ہر نوع کی تبدیلی مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ قدریں، ضرورتیں، نیتیں اور باہمی دلچسپی کے تمام اُمور تبدیلی کے مراحل سے بھی آگے جاچکے ہیں۔ ایک انسان کی بس کی بات نہیں کہ وہ قدامت پرست رہتے ہوئے جدیدیت کا دلدادہ ہو۔ اُس کے پاس ایک ہی راستہ ہے یا تو وہ ماضی کی روایات کا امین ہو، اُن روایات میں ذراسی تبدیلی نہ آنے دے یا جدیدیت کو صدقِ دل سے قبول کرنے کی ہمت پیدا کرے۔ اگر تو وہ ماضی کی روایات کو اوڑھونا بچھونا بنالیتا ہے تو بھی جدیدیت کی تمام تر رعنائیاں اُس سے دور ہوجائیں گی۔ وہ آج کی دُنیا میں رہتے ہوئے ماضی اور قدامت پرستی کی جیتی جاگتی مثال بن جائے گا۔ لبرل طبقہ کے نزدیک اُس انسان کی حیثیت جاہل جیسی ہوگی سب کچھ دیکھتے ہوئے ہر چیز کی انکاری اُس شخص کی ذاتی وصف میں شمار ہوگی۔ یہاں پر لبرل طبقہ اِس قسم کے نظریئے کا وسیع مفہوم اور معنوں میں اطلاق کرتا ہے۔[1] مثال کے طور پر جدید زمانے میں جتنے بھی مذاہب رائج ہیں ان کی تعلیمات ماضی کی جیتی

جاگیتی مثال ہیں۔ ان کو ہم جدید نہیں کہہ سکتے۔ اگر قدامت پرستی کا معنی و مطلب وہی ہے جو لبرل طبقہ بیان کرتا ہے تو آج کے مذاہب کی تمام تر تعلیمات کو یکسر مسترد کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ جدید دُنیا میں کسی نئے مذہب کا ظہور ہونا ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی نئے مذہب کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی بھی تو وہ سوائے چند مفروضات، بیانیے اور سابقہ ادیان سے مُستعار لی گئیں چیزیں ہی نظر آئیں گی۔ نیا یا جدید کا مفہوم واضح کرنا بہت مشکل ہوگا تو سوال یہ ہے کہ مطلب کیسے واضح ہو؟ اس ضمن میں دو سوال پیدا ہوں گے:

اول: قدامت پرستی کی نفی کرتے ہوئے جدیدیت کو قبول کرنے کی رِیت ڈالی جائے کہ جس میں متعدد پہلو کی توضیح نئے انداز میں اور جدید خطوط پر ہو۔ یہاں تک کہ حدود و قیود کو پھلانگتے ہوئے کسی بھی نوع کی پابندی کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا جائے۔ یہ جدیدیت کی نئی شکل ہوگی جس کی وضاحت قدامت پرستی سے ہٹ کر اور بنیاد پرستی سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے ایک ایسی بنیاد ڈالی جائے جس میں صرف آج ہی آج ہو، گذشتہ کل کا شائبہ تک نہ ہو۔

دوم: قدامت پرستی بھی رہے اور جدیدیت کا چہرہ بھی سامنے آجائے۔ گویا قدامت و جدیدیت کا حسین امتزاج ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ قدیم و جدید کو ایک ہی لڑی میں پرو کر عصرِ جدید کے اذہان کو مطمئن کرنا مشکل طلب کام ہے۔ بعض اوقات دونوں زمان کو باہم تطابق کرنے کی فکر میں ایک لاینحل مسئلہ درپیش ہوگا جس کی وضاحت لمحہ بھر کے لئے کرنا بہت مشکل اَمر ہے۔

پہلے سوال میں قدامت پرستی کی نفی کو اگر مان لیا جائے تو سماج کے انسان کے پاس کوئی ایسی بنیاد ہی نہیں ہوگی کہ بحث و مباحثہ کا پہلو سامنے لے آئے۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا کہ ماضی کی نفی کرنا گویا ایسا ہے جیسے کہ ہم ہر نظریئے کی بنیاد جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس نظریئے کی بنیاد یا اصل ہی نہ ہو اس کی تشہیر کیونکر ممکن ہے؟

دوسرے سوال کی رُو سے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم قدامت پرستی کی نفی کئے بغیر جدیدیت کو قبول کرنے کی رائے کو پسند کرتے ہیں بلکہ ہم تو یہ مشورہ دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جدیدیت کو قدامت پرستی کے طریقہ کار سے گزارا جائے اور ماضی کی روایات کا امین بنتے ہوئے دونوں زمانوں کو باہم مشترک سمجھا جائے۔ اس سوال کے تحت ایک اور نظریہ کی وضاحت کچھ یوں ہوگی کہ آیا قدامت پرستی اور جدیدیت کے عنوان کو باہم مشترک قبول کرنے کا کوئی پہلو ہے؟ اگر ہاں تو پھر طولِ تاریخ کے کئی گوشے کھینچ لانے ہوں گے۔ ہر پہلو کو باریک بینی سے بیان کرنا ہوگا۔

ہماری دُنیا خاص کر مسلم دنیا کی یہی چیز عجیب ہے کہ ایک راستہ متعین ہوچکا ہے تو اُس راستے سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے کا انتخاب منافیٔ عقل و خلافِ فطرت ہے۔ حالانکہ جس راستے کا انتخاب مقرر شُدہ ہے اس کی وضاحت ہوچکی ہے۔ اس میں کمی بیشی کی گنجائش بھی اُسی راستے کی پیمائش کو مدِ نظر رکھ کر کی جاسکتی ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ایک راستہ متعین ہوچکا ہے تو کسی دوسرے راستے سے

چلنا ممنوع ہے۔ ہاں شروعاتی لمحہ میں دُرست راستے کا انتخاب لازمی ہے۔ اگر ابتداء سے ہی غلط راہ کا انتخاب کیا گیا تو آگے آنے والے کئی راستے خلافِ فطرت اور قانونِ ابدی کے بر عکس ہوں گے۔ لہٰذا قدامت پرستی اور جدیدیت کو باہم ملانے کے لئے قوانین طبع و فطری اُصولوں کی نفی سے اجتناب کرتے ہوئے اصل کو بنیاد بنانا ہو گا اور ہم جانتے ہیں کہ اصل ہی دراصل قدیم ہے اور ہر قدیم شے دراصل جدیدیت کی بنیاد ہے۔ ہمارے اِس مقالہ کی بنیاد بھی یہی ہے کہ جدید کو قدامت سے منتھی کرتے ہوئے بعض ایسے انسانی رویئے آشکار کریں جن کے توسط سے سماج اور انسان کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔

تفصیلی متن:

سب سے پہلے ہمیں سماج اور اِنسانی زندگی میں موجود تطابق کو واضح کرنا ہو گا جس کے نتیجے میں اصلِ کلام کی وضاحت ہو سکے گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ جہاں توقف نام کی شے نہ ہو، حرکت ہی حرکت ہو وہ دراصل زندگی (سماج یعنی زمانہ) کہلاتی ہے۔ یہ زندگی دراصل افلاک کی گردش و حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے گذشتہ سال اور موجودہ سال، آج کا دن اور کل کا دن، اِس حرکت میں ماضی بھی ہے مستقبل بھی ہے اور حال بھی۔ جب تک گذشتہ کل حرکت نہیں کرے گا آج کا دن نہیں آسکتا۔ جب تک آج کا دن باقی ہے آنے والا کل نہیں آسکتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آج اور کل کا ایک زمان میں جمع ہونا محال ہے، آج جائے گا تو کل آئے گا۔[2] ہم تکتی آنکھوں اور پرکھتے اذہان سے محسوس کرسکتے ہیں کہ ہمارا یہ سماج حالتِ تحرک میں ہے اور جس قسم کے حالات رونما ہوتے ہیں اُسی نسبت سے اِنسانی رویوں کی ترتیب پاتی ہے۔ گویا حرکت کے اِرد گرد گھومتی زندگی و سماج اور اِنسانی رویوں کا آپس میں گہرا تعلق پیدا ہونا اِس لئے بھی ضروری ہے کہ اِنسان سماج کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ سکے اور تدابیر و تدراک پیدا کر سکے۔ عظیم فلسفی ملاصدرا نے حرکت اور زمانے (سماج) کی تغیر پذیر کو لازم جانا ہے۔ وہ حرکت اور زمانے کی ماہیئت کو تجدد، تغیر، گذشتی وانقضا سے مبرا نہیں مانتے۔[3]

صدیوں سے دُنیا کے شب و روز اسی معیار کے مطابق رواں دواں ہیں تا کہ زندگی کی حرکت جاری و ساری رہے۔ یہ جو انسان سے جُڑی دو حقیقتیں موت و حیات کیا ہیں؟ سابقہ علمی و مذہبی مواد کی طرف نظر کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ "حیات" زندگی کی اولین سانس کی اولین حرکت کہ جس کا تعلق صرف ایک انسان سے ہے اور وہ اس دُنیا میں زندگی سے جڑنے کا اولین فریضہ انجام دیتا ہے یعنی آنکھ کھولتا ہے، اپنے اِرد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ زندگی کے تمام تر اُمور اُس کے لاشعور میں رچ بس جاتے ہیں۔ دوسری حقیقت "موت" ہے۔ یہ ایک ایسی گھتی ہے جو انسان کو حرکتِ ابدی کی طرف کھینچ لے جانے کا باعث بنتی ہے، گویا زندگی کی اولین حرکت کا اختتامی مرحلہ موت ہے کہ جس کے بعد زندگی کی تمام حرکتیں منجمد اور فنا ہو جاتی ہیں۔ قدرتِ ازلی کا کمال ملاحظہ کیجئے کہ اسی دوران اُس جیسے ایک اور انسان زندگی کی پہلی سانس لے کر دُنیا کے مُتحرک ہونے کا ثبوت بن جاتا ہے۔ انسانی سماج کی بقاء کا تعلق بھی انہی دو حقیقتوں سے ہے۔ ایک انسان پیدا ہوتا ہے اور لا محالہ وہ انسان سماج کی استقامت کا باعث بن جاتا ہے دوسرا انسان

مر تا ہے اور اُس کا مرنا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ جائے گا تو دوسرا انسان آئے گا اور اُس مرنے والے کے خلاء کو پُر کرے گا۔ معلوم ہوا کہ سماج کی استقامت کا تعلق بھی حرکت سے ہی ہے جب تک حرکت جاری رہے گی نت نئے انداز میں سماج کا ظہور بھی ہوتا رہے گا۔ اور ہر معرضِ وجود میں آنے والا سماج انسانی رویوں کو ترتیب دینے کا باعث بنے گا۔

سماجی انسان کا بھیانک روپ:

سماج میں انسانی زندگی کا ہر لمحہ اُدھار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سماج انسان کے لئے کرایہ کا مکان جیسا ہے۔ جب تک کرایہ کی ادائیگی ہوتی رہے گی انسان مکین کے حقوق حاصل کرتا رہے گا۔ وہ یہاں کروٹ بھی بدلتا ہے تو اِجازت نامہ کا مُحتاج ہے۔ خود مختار کی اِصطلاح انسان کو عاریتاً دی گئی ہے۔ مختارِ کُل، عقلِ کُل، دانائے کُل جیسی اِصطلاحیں نہ جانے انسان سے کیوں منسوب ہوئیں ہیں۔ حالانکہ انسان کی فطرت میں، شعور کی گہری کھائی میں یہ بات میخوں سے گاڑ دی گئی ہے کہ ان اِصطلاحوں کے حقیقی مَصرف پیغمبرِ امین و صادق، حضرتِ محمد ﷺ ہیں۔[4]

پھر بھی انسان باغی ہے فطرت کا، عقل کا، اپنے دامنِ اختیار کا۔ جو اختیار اُس کو دیا گیا تھا اُس سے وہ تجاوز کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ازلی حیثیت اور بنیادی ذمہ داری کو فراموش کر چکا ہے۔ ماضی میں کبھی نمرود[5] بن بیٹھا، کبھی فرعون[6] بن کر ظلم کی علامت بن گیا، کبھی شداد و قارون[7] کی شکل میں مخلوقاتِ عالم کی دولت کو سمیٹنے لگا۔ وہ وقت کے ہر ظالم و جابر حکمران کی شکل میں سماج کی اکائی، عزت و نفس کو تار تار کر بیٹھا۔ دیکھا جائے تو اس سماج میں انسان کی کئی روشیں، کئی روپ اور کئی رویئے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا ہر رویہ اِس بات کا شاہد ہے کہ وہ انسان ہونے سے زیادہ حیوان ہونے کا ثبوت دے بیٹھا۔ حالانکہ اُس کو اچھی اور بُری خصلتیں دونوں تفویض کی گئیں تھیں[8]، پھر بھی وہ اُس خصلت کا اِنتخاب کر بیٹھا جو اُس کی ازلی حیثیت اور رُتبہ کے خلاف تھی۔ جس طرح انسان کا ماضی اُس کے سیاہ کرتوتوں سے بھرا پڑا ہے اُس سے کئی گنا زیادہ انسان کا حال ہے۔ آج کے سماج میں انسان کا رویہ اس قدر ناقابل برداشت ہو چکا ہے کہ وہ قتل بھی کرتا ہے اور صفائی دینا بھی گوارہ نہیں کرتا، ڈکیتی کی خصلتیں بھی اپنالیتا ہے اور شرمندہ بھی نہیں ہوتا، چوری چکاری بھی کرتا ہے اور سینہ زوری کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا، زنا بالجبر اور زیادتی بھی کرتا ہے لیکن مجال ہے کہ اُس کی انسانیت کو ذرا بھی شرم محسوس ہو۔

سماجی اقدار کی شکستگی:

انسانیت کو سب سے زیادہ خطرہ معاشرے کے گرتے ہوئے اقدار ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ قریب آج سے تیس، چالیس سال قبل کی انسانیت کم سے کم اخلاقی گراوٹ میں تو مبتلا نہیں تھی۔ رشتے ناطوں میں مضبوط بندش کی موجودگی نے اُن کے اخلاقی تشخص کو خاصا بلند کر رکھا تھا۔ خاص طور پر صلبی رشتوں میں پہاڑ جیسا تقدس بحال تھا۔ تایازاد، ماموں زاد،

خالہ زاد اور پھوپھی زاد جیسے قریبی رشتے اس قدر بامعنی تھے کہ سگی بہن اور چچا، خالہ، ماموں اور پھوپھی کی بیٹی میں کوئی تفاوت نہیں تھا۔ جب تک کہ بزرگوں کی باہمی رضامندی سے رشتہ طے نہ ہوتا تب تک دُلہا دلہن میں رشتے کا تقدس برقرار رہتا۔ اُن کے دماغ میں یہ بات نقش تھی کہ میاں بیوی کے رشتے سے قبل بھی وہ ایک قابلِ تقدیس رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ ماضی کی باتیں اور قدریں ہیں کہ جن کی پرچھائیاں آج ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ آج کے سماج میں رشتے ناطے سب ہیں، پر قدریں کہیں کھو گئیں ہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ وہ زمانہ جو تعلیم و تعلم سے قدرے کم آشنا تھا باوجود کہ تعلیم عام نہ تھی پھر بھی سماج میں بے حیائی کا عفریت بے لگام نہ تھا۔ جبکہ آج تعلیم عام ہے۔ ہر گلی میں تعلیم کے نام سے ادارے موجود ہیں۔ پھر بھی علم کی کرنیں مدھم نظر آتی ہیں جبکہ جہالت کا راج دیکھائی دیتا ہے۔

اوائلِ عمری سے ہی ہر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ بڑوں کا ادب سماج کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی انجام دہی کی اولین شکل یہی تھی کہ جہاں کہیں کوئی بڑی عمر کے انسان سے ملاقات ہو تو سلامتی بھیجنے میں پہل کرنی ہے۔ یہ سبق گھر کی دہلیز سے لے کر اسکول کے دروازے تک ہر بولنے والے اور پڑھانے والے کی زبان سے جاری ہوتا۔ تاسف ہے کہ یہ عمل اب بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ ہمارا سماج کہ جو کہنے کو تو اسلامی تعلیمات سے مزین ہے، پر اُس کی تعبیر اور تشریح کی تصویر بہت ہی بھیانک ہے۔ لوگوں میں سماجی ذمہ داریوں کو نبھانے کی ہمت کم ہوتی جارہی ہے اور ایسے وضع قطع کے اقدار اپنائے جارہے ہیں کہ جن کا نہ ہماری تہذیب سے کوئی تعلق ہے نہ ہمارے رہن سہن سے کوئی میل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی مقدس تعلیمات اور ہمارے سماج کی منتظم روایات میں وہ تفاوت عود کر چکا ہے کہ جس کو میں اگر "منافقانہ عمل" سے تشبیہ دوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ہم نے دین کا سبق تو بہت اچھی طرح یاد کر لیا لیکن عملی تعبیر کے لئے وہ حقیقی مقام حاصل نہ کرپائے کہ جس کی ہمارے سماج کو اشد ضرورت تھی۔ زندگی کے کسی بھی شعبے کی کتاب اُٹھا کر دیکھیں فریب سے لے کر قتل و غارت گری کی خوفناک شکلیں بلا چون و چرا نظر آتی ہیں۔ ہماری انسانیت کے تمام اعمال حقیقی معنوں میں اخلاق باختہ ہو چکے ہیں۔ بظاہر ہم "ترقی یافتہ" نظر آتے ہیں لیکن اندورنی طور پر ہماری روح گھائل اور روحانیت آلودہ ہو چکی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم نے اپنے سماجی اقدار کو تحفظ دینے میں کوتاہی برتی ہے اور اپنے حقیقی مقام کی ادائیگی سے منہ چُرایا ہے۔ کیا ہی عالم دین ہو، اُستاد ہو، تاجر ہو کہ سماج کے کرتا دھرتا یہاں تک کہ ماں باپ بھی، ہر ایک کی تہذیبی و تربیتی روش اور عملی کردار عقل و منطق سے دور نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج کی اونچی اُڑان اب اخلاقی قدروں کی تلاش میں ہے۔ وہ انسانیت کے بالفعل کردار سے نالاں ہے بلکہ کسی حد تک مایوس بھی ہے۔ وہ کسی مسیحا کے انتظار میں ہے جو سماج کے نبض کو ٹٹولے اور گھائل روح کا بھرپور علاج کرسکے۔

مرد و عورت، سماج کے دو حقیقی کردار:

ایسا کیوں ہے کہ اِنسان اپنے سماج سے قریبی تعلق رکھتے ہوئے بے تعلق نظر آتا ہے۔ بعض اوقات اپنے حدود و قیود سے آزاد رہ کر غیر یقینی کردار ادا کرتا ہے۔ اِس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ اِس سماج میں دو حقیقی کردار مرد اور عورت نظر آتے ہیں جو سماج کی بڑھوتری کا باعث بنتے ہیں، یا بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک کی کمزوری یا غیر ذمہ داری ظاہر ہو گئی تو سماج کی بنیادیں درست طریقے پر اُستوار نہیں ہوں گی۔ لیکن اصل مسئلہ یہی ہے کہ مرد اور عورت دونوں نے ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کی روش اپنائی ہوئی ہے۔ ماں جیسی ہستی کا نعم البدل تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہ ہستی ہے کہ جس کے قدموں تلے جنت کا حصول رکھا گیا ہے۔(9) اسلامی قوانین و ضوابط سامنے رکھیں تو ہمیں ہر ہر فرد کی ذمہ داریاں الگ الگ نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر خاندان کے بزرگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کے ادھیڑ عمر افراد سے لے کر کم عمر بچوں کی اصلاحی تربیت کریں، یعنی ہر ہر موڑ پر اُن کی ذہنی، فکر اور عملی تربیت ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔ اسی طرح ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھیں۔ باپ کی انفرادی ذمہ داری ہے کہ وہ نان و نفقہ کا بیڑا اُٹھائے، ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو زمانے کی نیرنگیوں سے باخبر رکھے۔ اسی طرح ایک بیوی کا فرض ہے کہ وہ اپنے میاں کی سکونت اور دیگر اُمور کا خیال رکھے۔(10) غرض یہ کہ اسلام کے قوانین ہر طرح سے مکمل ہیں، ان میں رہنمائی ہے، وسعت کی گنجائش ہے۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات کو اگر ہم سامنے رکھیں تو یہاں نہ مرد بری الذمہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو اور نہ ہی عورت کو کوئی خُلاصی ہے۔ جو جس کی ذمہ داری ہے وہ اُس قدر اپنے فرائض انجام دے گا۔ سوال آج کے معاشرے کا ہے، اس میں مرد اور عورت میں سے کس کی طرف سے غفلت کا اظہار ہوتا ہے، اِس مسئلہ کی توضیح و تشریح ضروری ہے۔ صرف ایک شخصیت کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے۔

مرد کو شکایت ہے کہ تاریخ انسانیت میں ہمیشہ سے ہی عورت نے مرد کی سادگی سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ مرد نے ایک عورت کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ماں باپ، بہن بھائی اور عزیز و اقارب کو یکسر چھوڑ دیا اور عورت کے لئے عظیم سے عظیم تر قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ اگر عورت کے لئے مر مٹنا خود عورت کے نزدیک منافقت ہے تو پھر عورت کی رواجی، سماجی، مذہبی اور صنفی حیثیت کس طرح سے آشکار ہو گی؟ اگر عورت مرد کو ہر ہر راستے سے منحرف کر کے ''مظلوم و مقہور''، ''معصوم و مامون'' ٹھہر سکتی ہے تو مرد کے جرائم بھی اس قدر سنگین نہیں ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سوال بہت پیچیدہ ہے کہ سماج کے حقیقی کرداروں میں سے کس کی طرف سے کمزوری اور سُست روی ظاہر ہو گئی ہے، بطور تبصرہ نگار ہمارے لئے حتمی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو گا۔ اگر آپ کسی مرد کو موردِ الزام ٹھہرائیں کہ آپ اپنے سماجی رُتبے سے بے غافل ہو چکے ہیں تو وہ کبھی اقرار نہیں کرے گا کہ سماجیانہ عمل میں اُس کی شراکت واجبی سی رہ گئی ہے۔ یا کسی عورت کو کاہل اور سُست رو کہیں تو بھی تسلیم نہیں کرے گی۔ اصل میں سارا فساد اور تنازع ہی اس بات پر ہے کہ مرد

اور عورت دونوں خود کو معصوم عن الخطاء سمجھتے ہیں، دونوں کا خیال ہے کہ غلطی ساری صنفِ مخالف کی ہے، میں تو کبھی غلطی کا/کی مرتکب نہیں ہوا/ہوئی۔ تو بتایئے کہ ہم کسی ایک صنف کی "سماجی ذمہ داری" کو کیسے ناپ سکتے ہیں؟ جبکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ازدواجی معاملات میں مرد اور عورت دونوں سے ہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

ازل سے ہی مرد عورت زندگی کے دو اہم ستون کے طور پر شناخت رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم، نہ ایک سے زندگی کی بقاء ممکن ہے اور نہ ہی ایک کے بغیر نسل میں دوام کا عنصر۔ ایک کی خلقت ہوئی دوسرے کے لئے اور دوسرے کی زندگی پہلے والے کی۔ زندگی کو ایک دوسرے کے لئے وقف کرنے کا یہ سماجی جذبہ میاں بیوی جیسا رشتہ تخلیق کرنے کا باعث بنا۔ باہمی اشتراک نے پہلے گھر کی شبیہ ترتیب دی۔ پھر معاشرتی ساخت کو وضع کیا۔ لہٰذا سماجی اِرتقاء اور اِس کے نظم وضبط میں بلوغت کے بعد انسانی سوچ عامیانہ حدود سے نکل گئی۔ اب وہ کمرشلائزیشن کی مکمل تصویر بن گیا ہے۔ یہاں باہمی تعلق خلوص وایثار سے زیادہ مادیت کے مرہونِ منت ہو گیا ہے۔ ایک طرف بنتِ حوا دُہائیاں دے رہی ہے کہ وہ مظلوم ہے، مقہور ہے، مفتوح ہے یہاں تک کہ مرد کے ہاتھوں ہر وقت مقتول ہے۔[11] دوسری طرف اپنی اَنانیت میں گرفتار مرد کو شکوہ ہے کہ وہ پہلے بھی انصاف پرور تھا اور اب بھی انصاف کے تقاضوں کا مکمل عملی تصویر بنا ہوا ہے۔ مرد کے خیال میں اُس پر لگے الزامات کا یہی جواب ہو سکتا ہے کہ عورت کی عقلی جبلت کمزور ہے۔ اپنی معصومانہ صورت لئے مرد کی بے باکی سے، سادگی سے اور خلوص سے بھرپور فائدہ اُٹھاتی ہے۔ لیکن کیا اِس حقیقت سے فرار ممکن ہے کہ عورت کی نرم مزاجی، نازک مزاجی اور رحم دلی کا ہمیشہ سے فائدہ اُٹھانے والا کوئی اور نہیں مرد رہا ہے۔ بڑا ہی "مرد" بنا پھرتا ہے جو عورت کو ہمیشہ مصیبت میں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ عورت کی کہانی بڑی طولانی ہے۔ وہ اُس وقت اپنی زندگی کا آغاز کرتی ہے جب آدم کو غیر محسوس طریقے سے کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی (اسلامی تاریخ کے بعض پہلو اس سلسلے میں بطور حوالہ دیکھے جاسکتے ہیں) گویا تنہائی کی مونس وموجب عورت کی عظیم ذات ہے پھر بھی مرد اپنی مردانگی کو ثابت کرنے کے لئے عورت کی بنیادی آزادی، حقِ زندگی اور حقِ حرمت کو تخت وتاراج کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ قدرت نے مرد کے اُس اِحساس کو رفع کرنے کے لئے عورت کو وجود بخشا جو پہلے پہل آدم میں سرایت کر گیا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ عورت کی تخلیق مرد کو اِحساسِ تنہائی سے باہر نکالنے کے لئے کی گئی ہے۔[12] زندگی اور معاشرے کے بنیادی جواز کا نمونہ آدم وحوا کی خلقت سے ملتا ہے۔ کلامِ پاک سے مفہوماً استفادہ کرتے ہوئے ہم یہ کہنے کی جُرأت پیدا کرتے ہیں کہ دونوں جنت کی زندگی کا خوب لطف اُٹھا رہے تھے۔ قدرت کی طرف سے مکمل آزادی تھی۔ نہ حد بندی کا کوئی قانون اور نہ ہی حالتِ تحرک سے باہر نکالنے کی کوئی مہم۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ انسانی نسل کی پرورش بڑے ہی ناز ونعم میں ہو رہی تھی۔ انسان کی اصلیت بندر بتانے والوں کو ذرا اس پہلو سے غور کرنا ہوگا کہ وہ جگہ جہاں آدم وحوا عیش ونشاط کی زندگی بسر کر رہے تھے وہ بندروں کی زندگی سے بہت ہی الگ تھلگ اور عقل ومنطق سے بھرپور تھی۔ سوال وجواب، حکم وعمل، خوشی ومُسرت کی تمام تر رعنائیاں موجود

تھی۔ بھلا ایک بندر ان تمام سہولیات سے کب مستفیض ہونے لگا؟ عیش و نشاط تو پھر بھی صحیح لیکن سوال و جواب، حکم و عمل اور عقل و منطق سے بندر کی نسبت کا جواز تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے سُمندر سے ایک سوئی کو ڈھونڈ نکالنا۔ پھر بھی بضد ہیں کہ انسان بھی کبھی بندر تھا کہ ترقی کرتے کرتے موجودہ ساخت اختیار کر گیا۔ اس نظریئے کے شیدائیوں کو غور کرنا ہو گا کہ شروعاتی دور کے دونوں انسان بھی بالکل انہی عادات و صفات سے متصف تھے جن عادات و صفات کے ہم آج امین ہیں۔ ہاں! یہ فرق ضرور ہے کہ آج کا انسان خصلت کے اعتبار سے بندر نظر آرہا ہے۔ ماضی کا انسان تو عادتاً، خصلتاً اور عُرفاً بھی انسان تھا۔ وہ تبدیلی کی نذر ہو گیا۔ آج انسان تو ہے پر عادتیں، خصلتیں اور روشیں سب بدل گئیں ہیں۔ بات ہو رہی تھی کہ عورت کی کہانی کی کہ، حضرت حوآ کی خلقت نے کائنات میں مرد و زن کی لکیر کھینچ دی اور صنفِ مخالف کا تصور اُبھرا۔ پُر تعیش جگہ اور سکوت و آرام کو اُس وقت گہن لگ گیا جب ”شجرِ ممنوعہ“ کی طرف نہ جانے کا قبل از حکم آیا۔ سمجھا دیا گیا کہ اگر ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی یا حکم عدولی کی گئی تو پھر سزا بھی سخت ہو گی۔ کلامِ عظیم نے ”ظالمین“ ہونے کی نوید سُنائی دی۔[13] حوآ کی سرشت میں کیا تھا وہ ہماری علمی ”بصیرت“ سے ماوراء ہے لیکن یہ بات ضرور معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے مزاج میں اُس دن واضح تفاوت دیکھا گیا۔ آدمؑ کی سادگی اور روحانی خصلت نے اس حکم کو اپنی گٹھی میں باندھ لیا البتہ حوآ کی متلون مزاجی نے اُس کو شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے پر مجبور کیا۔[14] وہ اکیلی ہی یہ عمل انجام دیتی تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن حوا کے کہنے پر آدم بھی شجرِ ممنوعہ کے قریب گئے اور بالآخر حکمِ عدولی کے مرتکب ہوئے اور ترکِ اولیٰ جیسی خطاء اُن سے سرزد ہوئی۔ اللہ رب العزت نے دونوں کو عیش و نشاط کی زندگی سے بے دخل کر دیا اور زمین کی طرف روانہ کر دیا۔

مندرجہ بالا صورتِ حال کے تناظر میں کیا یہ ممکن ہے کہ مرد و عورت کے درمیان ایک ایسی لکیر کھینچی جائے کہ جو دونوں کے درمیان تفاوت پیدا کرے؟ نہ صنفی امتیاز کا خطرہ رہے گا اور نہ ہی جنسی حراسیت کا کوئی واقعہ رونما ہو گا۔ نہ ظالم بننے کا عمل بار بار دُہرایا جائے گا اور نہ ہی مظلوم بننے کی دُہائی سننے کو ملے گی۔ بس سُکون ہی سُکون ہو گا۔ دونوں صنفِ مخالفین اپنی اپنی دُنیا میں مست، مگن اور عیش و نشاط کی محفلوں کے مستقل گاہک بنے بیٹھیں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے کہ ہر روز مرد و عورت کی کہانی بڑے طمطراق سے بیان کی جائے اور پھر لوگوں کے اذہان کو بھی متوجہ کئے جائیں کہ دیکھو بھئی! فلاں خاتون کے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے اور فلاں لڑکی مرد کی درندگی کا نشانہ بن گئی ہے۔ ہر طرف مرد کی ظالمانہ روش ہی زیرِ بحث کیوں؟ کبھی عورت کی حرکتوں کا بھی تو چرچا ہو۔ مرد عورت کے مساویانہ نظریئے کے قائل لوگوں سے ذرا سوال تو ہو کہ جب زندگی کے ہر شعبے میں عورت مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے تو پھر مظلوم بننے کی فنکاری کس لئے؟ یہ موقف اُن لوگوں کی طرف سے آشکار ہوتا ہے جو عورت کی خصلت کو نہ سمجھنے کی رسم بڑی خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں۔ جب حقیقت کی طرف منہ موڑا جائے تو مرد کی ذات میں تبدیلی کے کئی پہلو نمایاں ہوں گے، مرد کی سرشت میں ہے کہ وہ باپ، بھائی، شوہر اور سربراہِ خاندان سے قبل بھی ایک مرد ہے اور اُس کی مردانگی کا اِس مثبت کردار کے علاوہ ایک بھیانک روپ بھی ہے جو عورت کی

شخصیت اور ذات کو تخت و تاراج بننے کا باعث بنتا ہے۔ یقین نہیں آتا تو ذرا قصور کی ننھی زینب اور دیگر معصوم بچیوں کی حالتِ زار پر غور کریں۔ مرد کے پوشیدہ کرداروں میں سے ایک بھیانک کردار عمران علی چشتی نے سماج کی ہر بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ ننھی کلی کو اس طرح روندھ ڈالا، کچل ڈالا اور مسل ڈالا کہ "ہائے انسان" کی صدائیں بھی اب گھٹی گھٹی سی ہو گئیں ہیں۔ وہ معصوم کلیاں کہ جنہوں نے ابھی کِھلنا تھا وہ مرد کی انسانیت کے ہاتھوں فنا ہو گئیں اور مرد آج بھی انسان ہے اور سماج کو اپنے ہاتھوں سے نچارہا ہے۔ پھر مرد کی انسانیت کی قاتلانہ ادا تو ملاحظہ کریں کہ وہ قانون کا محافظ بننے کے بجائے قاتل بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ نقیب اللہ محسود کو اِسی زُمرے میں قتل کر ڈالا۔ مرد کی انسانیت نے راؤ انور کے روپ میں موت کے سوداگر والا رویہ اپنایا اور بڑے آسانی سے قتل کر کے پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہاں مرد کی اِنسانیت کی پکڑ ہو گئی۔ اُدھر مردانگی نے پیار و محبت اور پسندیدگی کا خول پہن لیا اور اِس رویئے کا اظہار کوہاٹ میں ہوا۔ جس کا بظاہر روپ مجاہد آفریدی کی شکل میں نظر آیا۔ عاصمہ نامی میڈیکل کی طالبہ اُس کی انسانیت کی بلی صرف اس وجہ سے چڑھ گئی کہ وہ خاتون زوج کے لئے رضامند نہیں تھی۔ مرد کی انسانیت کے لئے کب گوارہ تھا کہ وہ "نہ" سُنے۔ مستقبل کے سُہانے خواب سجانے والی یہ معصوم طالبہ مرد کے بھیانک حال کی بھینٹ چڑھ گئی۔ گذشتہ کئی عشروں سے مرد نے افغانستان، شام، یمن، عراق اور پاکستان میں ہر جگہ قاتلانہ رویئے کا اظہار کیا ہے اور نتیجتاً کئی سو بے گناہ لوگ موت کی وادی میں چلے گئے ہیں۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مرد کا یہ رویہ رُکنے کا نام نہیں لے رہا۔ سماج کے ایک اہم رُکن عورت سے مرد کا یہ رویہ بہت ہی بھیانک اور دردناک ہے۔

جدید مسلم سماج کی عامیانہ حالت:

ہم نے سطور بالا میں اِنسانی رویوں اور سماج کے تطابق کو واضح انداز میں بیان کیا۔ اب اختتامی مرحلہ کی جانب بڑھتے ہوئے مسلم سماج میں موجود اِنسانی رویئے کو تین پہلو سے آشکار کریں گے:

اول: وہ مسلمان کہ جس کا رویہ حقیقی معنوں میں دینِ اسلام کی تشریح، نمائندگی اور شناخت کا باعث بن رہا ہے۔ دراصل یہی وہ رویہ ہے کہ جو مسلمانوں کے تمام تر اعمال، عقائد اور عبادات کا امین بھی ہے۔ کہیں کہیں صداقتی روش کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس قسم کے رویہ کا پایا جانا مُسلم سماج کے لئے کسی نعمتِ عظمٰی سے کم نہیں۔ رہی بات کہ ہم اس رویہ کو کہاں ڈھونڈیں اور اُس کی نشاندہی کیسے کی جاسکتی ہے تو یہ اَمر بہت آسان اور سہل ہے۔ آپ جایئے اُن معاشروں میں جہاں شخصی فوقیت سے زیادہ اجتماعی روش کو ترجیح دی جاتی ہے، وعدے وعید سے زیادہ عملاً زندگی گزارنے کا رجحان ہے، جہاں رعب و دبدبہ کی نمائش کے بجائے اخلاقیات ہی زندگی کے اُصول ہیں وہی معاشرہ ہمارے لئے لائقِ تقلید ہے۔

دوم: وہ مُسلمان کہ جس کا معاشرتی رویہ حد سے یا ضرورت سے زیادہ مُقلّدانہ ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ دُنیا سے اور دیگر مذاہب سے مساویانہ روش کی خواہش لے کر دین کی بعض بنیادی باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات اسلاف (یہاں

پیغمبرِ اکرم ﷺ کی شخصیت مُبارک مراد ہے) کی زندگی کو سنجیدگی سے بیان کرنے کے بجائے رازونیاز اور مبہم تشریح کے قائل ہیں۔ یہ رویہ حقیقی معنوں میں اسلامی سماج کی نمائندگی نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ نظریہ ضرورت کے تمام تر پہلو اس رویہ پر کُلاً منطبق کئے جاسکتے ہیں۔ ایک مثال کی طرف توجہ کیجیئے: امریکہ میں نائن الیون حادثہ کے بعد بعض مُسلمانوں کو اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ ہو نہو کہ ہمیں اسلام کے "فراخدلانہ" (یہ لوگ وقت کے تیز دھارے میں بہنے کے عمل کو فراخ دل کہتے ہیں) پہلو کو سامنے لانا چاہیے۔ اُنہوں نے اسلام کی وسیعُ المطالعہ تعلیمات کو چھوڑ کر صرف ایک ایسی روش کی عملاً مثال پیش کی کہ جس کی گنجائش آج تک کے مُسلم سماج میں موجود نہیں تھی۔ وہ خواتین کے حقوق کی آڑ میں نماز جیسی بنیادی عبادت کو زیرِ بحث لئے بیٹھے اور کہا کہ "ایک عورت بھی نماز میں اِمامت کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔" اور پھر عملی تصویر پیش کرتے ہوئے ایک خاتون کے پیچھے جو شریعی اُمور کو سمجھنے کی دعویدار تھی،، نماز ادا کی گئی۔[15] اُس جماعت میں مرد و خواتین سب شریک تھے۔ حالانکہ مُسلم سماج کی چودہ سو سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ فقہی اعتبار سے عورت اِمامت کے فرائض انجام نہیں دے سکتی، البتہ بعض موارد جیسے عورتوں کے اجتماع میں پیش نماز کا اجازہ موجود ہے۔[16] عمومی طور پر یہ ذمہ داری مرد کو سونپی گئی ہے۔[17] یہاں مرد کو امامت کی ذمہ داری سونپنے کا مقصد فضلیت نہیں بلکہ ذمہ داری کی تقسیم کا ایک عملی مظاہرہ ہے کہ مُسلم سماج میں عورت اور مرد کے جُدا جُدا فرائض کا تعیُن ہو۔ ایک منطقی اور تاریخی حقیقت بھی ہے کہ باکمال اور باوصف خواتین کی موجودگی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے رسالت اور اِمامت کا فرض عورت کے کاندھوں پر نہیں رکھا۔ صرف مَردوں کو ہی اس اَمر کے ذمہ دار اور امین ٹھہرایا گیا۔ لہٰذا یہ تقسیم کسی فضلیت کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ ذمہ داری کو باٹنے کا ایک خوبصورت سلیقہ تھا۔ غرض یہ کہ اس قسم کے رویئے کے حامل افراد مُسلم سماج کے لئے نمائندگی کا حق ادا نہیں کرسکتے۔

سوم: عصری دُنیا میں مُسلم سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے کہ وہ اپنے رویئے کو متشددانہ انداز میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ بد قسمتی سے ایسے لوگ دُنیا کے ہر سماج میں موجود ہیں لیکن صرف مُسلمانوں کے ذریعے ہی اس روش کی توجیح کی گئی۔ اس میں کہیں کہیں حقیقت بھی ہے کہ شدت پسندی کی وسیع جڑیں آج مُسلم سماج میں ہی ہیں۔ آج مسلمان قتل بھی ہو رہا ہے اور سامراج کا آلہ کار بن کر قاتل بھی بن رہا ہے۔ عصری سماج میں اگر کوئی اُتھل پتھل ہے تو وہ مسلمانوں میں ہی ہے۔ کہیں عراق تو کہیں شام، کہیں یمن تو کہیں مصر اور کہیں فلسطین ہر جگہ مُسلمانوں کی شبیہ خراب ہو رہی ہے۔ مخالف سماج کے لوگوں میں اب یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ: "مسلمان شدت پسند، دہشت پسند اور اِنسانیت دشمن ہیں۔"[18] حالانکہ غیر جانبداری سے اگر تجزیہ کیا جائے تو اسلامی تعلیمات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اس دین میں امن و سلامتی ہی اولین ضرورت اور شناخت ہے۔ دینِ اسلام کی عمومی تعلیمات کے مطابق ایک مسلمان کے لئے دین کے راستے پر چلتے ہوئے خراب اور انسانیت کے قاتل راستے کا انتخاب دُرست عمل نہیں ہے۔

نتیجہ بحث:

اس مقالہ کی مجموعی بحث سے بعض کلیات اور بعض جُزئیات آشکار ہوئیں۔ کلی طور پر ہم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ انسانی ہیئت کے دو اصناف مرد و عورت کے رویوں میں بسا اوقات قرابت و تعلق داری کا عنصر پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات سرد مہری کی روش عود کر آتی ہے۔ البتہ اِن دونوں اصناف کا مجموعی رویہ سماج کی ترتیب و تنظیم کے پسِ پردہ متحرک رہا ہے۔ مرد و عورت کے فکری و ذہنی اختلافات و تنازعات اپنی جگہ لیکن ان دونوں کی منطقی روش سماج کو ترقی یافتہ شکل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ عام ادراک یہی ہے کہ مرد طولِ تاریخ میں ہمیشہ سے حاوی رہنے اور حکم چلانے جیسے عمل کا مرتکب ہوا ہے جیسا کہ ہم نے مقالہ ہذا کے متن میں اِس جانب اشارہ بھی کیا، اس ادراک اور نظریہ کی کہیں نہ کہیں حقیقت بھی موجود ہے اور کسی قدر ثبوت بھی ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ گھر کی سربراہی و بھاری ذمہ داری کے حامل مرد کو سماج کی طرف سے اِس لئے بلند مرتبہ تفویض ہوا کہ وہ جہاں عورت کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھاتا ہے وہی معاشی ضروریات پوری کرنے کی جتن بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج نے اپنے تئیں خیال قائم کر لیا کہ مرد کی ان دو ذمہ داریوں کے سبب اُس کو تفوق حاصل ہے جبکہ اس کے برعکس عورتوں کو بلند مرتبہ سے نوازنا خلافِ عقل و منطق اور روایات کے منافی سمجھا گیا۔ یہ روش دراصل سماج کے متوازن چہرے کو بگاڑنے کا سبب بن گئی اور مرورِ زمانے کے ساتھ اِس کی چھاپ گہری ہوتی گئی، یہاں تک کہ اکیسویں صدی نے پورے آب تاب کے ساتھ قدم رکھا۔ ایک طرف نت نئ ٹیکنالوجی کی کھپت تھی تو دوسری طرف شعور و آگاہی میں کئی سو گنا اضافہ ہوا۔ یہی وہ عرصہ تھا جس میں مردوں کی حاکم داری کے باوجود عورتوں کی علیحدہ شناخت اور مقام کے حصول کے لئے جدوجہد کا آغاز ہوا۔ آج کی عورت جدید سماج کے اہم ستون کی حیثیت سے اپنی نمایاں پہچان رکھتی ہے اور یہ علیحدہ شناخت اس لئے تفویض نہیں ہوئی کہ وہ بحیثیت عورت اِس سماج میں اپنا وجود رکھتی ہے، بلکہ اِس لئے مقام ملا کہ عورت بھی مرد کی طرح سماجیانہ عمل میں برابر کی حصہ دار ہے۔ لہٰذا جہاں سماج کی جداگانہ حیثیتیں متعین ہوں گی وہاں مرد و عورت کی ذمہ داریاں بھی تقسیم شُدہ ہوں گی۔ یہ عمل (جداگانہ حیثیت اور تقسیم شُدہ ذمہ داری) دراصل سماج میں موجود انسانی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے، خاص طور پر سماج اور انسانوں رویوں کے درمیان موجود تعلق کو اور نمایاں کرتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سماج کے یہ دونوں اہم ستون (مرد و عورت) فضلیت و برتری اور ذمہ داری نبھانے کے حوالے سے بھی کافی تفاوت رکھتے ہیں۔ ایک کا منشاء ہے کہ وہ سماجیانہ عمل کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرے اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کا اکلوتا وارث ہو۔ دوسرے کی خواہش ہے کہ زیادہ کی تعظیم نہ صحیح کم سے کم برابری کا درجہ تو تسلیم کیا جائے۔ آخر الذکر طبقہ (عورت) کو یقین ہے کہ جس قسم کے درجات کا مالک مرد ہے اگر اُس کی تقسیم میں عورت کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو سماج میں فضلیت و برتری کا عنصر ختم ہو جائے گا اور مساویانہ عمل کی بہترین مثال سامنے آئے گی۔ ہم اِس پہلو سے متن میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے قرار دیا ہے کہ فضلیت کا

معیار صنفی اعتبار سے نہیں بلکہ کسبی اعتبار سے متعین کیا جائے گا، جس کو قرآنِ مجید نے تقویٰ کے نام سے موسوم کیا ہے۔[19] معلوم ہوا کہ سماج کا تہذیبی، تعلیمی، تمدنی اور اختیاری عمل کسی ایک صنف سے منصہ شہود میں نہیں آسکتا بلکہ دونوں صنفوں کے ذریعے سماج کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ ہم اُسی سماج کہ جس کی تشکیل میں مرد و عورت دونوں کا کلیدی کردار ہے، میں انسانی رویوں کی کھوج میں ہیں اور اِس امر کے بھی متلاشی ہیں کہ انسانی رویوں اور سماج میں مطابقت کا عنصر کیسے پیدا ہو گا۔ ہماری گفتگو کا ماحصل بھی اِسی ایک نقطہ سے مربوط ہے۔

انسانی رویوں میں تبدل و تغیر کا کسی حد تک انحصار سماج کی بدلتی ہیئت کے ساتھ ہے۔ جیسے سماج کی روش ہو گی اُسی قدر انسانی رویوں کی تربیت ہوتی رہے گی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جن معاشروں میں ترقی کے اعلیٰ منازل طے کر لئے گئے وہاں اِنسانی رویوں میں بھی ارتقاء و تبدّل بھرپور طریقے سے دیکھا گیا۔ وہ معاشرے اِس لئے بھی جدیدیت کے پیشرو ٹھہرائے کہ اُنہوں نے سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ ذاتی رویوں میں بھی تبدیلی کا سفر جاری رکھا۔ ایک ایسا سماج جہاں رویوں میں تبدیلی کے لئے جدوجہد نہ ہو وہاں فسطائیت اور جمودیت جیسے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔ وہ سماج اِنسانی مسائل کا گڑھ بن جاتا ہے۔ سماج کو ترقی یافتہ بنانے کے لئے مثبت رویوں کا اظہار ضروری ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب سماج اور انسانوں رویوں میں گہری مطابقت ہو۔

بعض جزئیات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ہم نے خصوصیت کے ساتھ مسلم سماج کی ذہنی روش اور عمومی رویوں کو تین نکات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اس عمل سے ہم نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ اِس وقت مسلم سماج کے باسیوں کو سب سے زیادہ رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مسلم سماج کا عمومی رویہ خود ساختگی اور خوش فہمی کا شکار ہو چکا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہو گی کہ تقریباً ہر مسلمان سب کچھ کر گزرنے کے باوجود خیال کرتا ہے کہ وہ مقدس ہے اور دیگر اقوام کی نسبت اللہ سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ تعلق اُس کو سزاء سے بھی بچائے گا اور شفاعت کا حقدار بھی ٹھہرائے گا۔ جس ریاضت (تقویٰ) کی اسلامی تعلیمات میں بار بار نشاندہی کی گئی ہے اُس کو نظر انداز کر کے اپنے دل میں خوش فہمی پالنا اس بات کی علامت ہے کہ مسلمانوں نے عملیت پسندی سے کام لینے کے بجائے روایت پسندی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلم سماج مسلسل حالتِ تحرک میں ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ رویوں کا شکار ہو چکا ہے اور یقینی بات ہے کہ یہ موضوع مزید تحقیق کا متلاشی ہے۔ اُمید ہے کہ محققین حضرات اِس پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ آخر میں ہم بعض نکات کی نشاندہی کرنا چاہیں گے اور یہ نکات خلاصۃ الخلاصہ کے آئینہ دار ہوں گے:

اول: اس مقالہ کے ذریعے سماج اور اِنسانی رویوں کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، خصوصیت کے ساتھ دونوں خصلتوں میں موجود مطابقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

دوم: بعض ایسے اُمور کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو اِنسانی نفسیات کی تشریح کا باعث بنتے ہیں۔ زیرِ بحث عنوان کے تحت پہلے پہل اِنسانی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا ہے بعد ازاں سماجی تناظر میں اُن نفسیات کا تجزیہ و تحلیل کیا گیا ہے۔

سوم: یہ مقالہ اِس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سماج کے دو اہم ستون مرد، عورت کے موجودہ فرائض اور ذمہ داریوں کو متعین کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ خاص طور پر مرد اور عورت کی سماجی حیثیت کو فوقیت دی گئی ہے۔

چہارم: تاریخ انسانیت کو بنیاد بنا کر مرد کے تہذیبی و سماجی رُتبہ کو واضح کیا گیا جبکہ صنفِ نازک یعنی عورت کی عزت و وقار اور سماجی مقام کو انفرادی و خصوصی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

پنجم: اِسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسے اُمور کی وضاحت کی گئی ہے جو سماج کو مستحکم کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

حوالہ وحواشی

(1)۔ پروفیسر ڈاکٹر عارفہ، فرید، تہذیب کے اُس پار: عصر حاضر کے مسائل اور اسلامی فکر مغربی فکر کے تناظر میں، (کراچی، کراچی یونیورسٹی پریس، 2000ء)، 19,18

(2)۔ ہمدانی، عینُ القضاۃ، غایۃُ الامکان فی درایۃ المکان (مترجم: لطیف اللہ)، (کراچی، مکتبہ ندیم، 1984)، 155

(3)۔ شیرازی، صدرالدین، اسفارِ اربعہ، حصہ اول، جلد دوم، (مترجم: گیلانی، مولوی سید مناظر احسن)، (حیدر آباد دکن، دارُ الطبع، جامعہ عثمانیہ سرکارِ عالی، 1944ء) 1197

(4)۔ اللہ کے نبیؐ مختارِ کل ہیں جیسا کہ آپؐ نے خود ارشاد فرمایا: قال رسول اللہ ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراہیم اسمٰعیل واصطفیٰ من ولد اسمٰعیل بنی کنانۃ واصطفیٰ من بنی کنانۃ قریشاً واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم، رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی اولاد سے اسماعیل کو چُنا اور اولادِ اسماعیل سے بنو کنانہ، بنو کنانہ سے قریش، قریش سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔ بحوالہ:

ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، باب ماجاء فی فضل النبی، حدیث: 1539، (مترجم: مولانا ناظم الدین)، (لاہور، مکتبۃ العلم، ندارد) 674،

اسی طرح آنحضرت ﷺ عقل کی بلندی پر تھے۔ مدارجُ النبوت میں لکھا ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے آغازِ دُنیا سے انجامِ دُنیا تک تمام لوگوں کو جس قدر عقلیں مرحمت فرمائی ہیں ان سب کی عقلیں، نبی کریم ﷺ کی عقل مبارک کے پہلو میں دُنیا بھر کے ریگستانوں کے مقابلہ میں ذرہ کی مانند ہیں۔ بحوالہ:

دہلوی، عبدالحق محدث، مدارجُ النبوت، ج ا، مترجم: مفتی سید غلام معین الدین نعیمی، (لاہور، شبیر برادرز، 2004ء)، 56

(5)۔ نمرود کو خبط تھا کہ جس طرح موت و حیات کا اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اسی طرح وہ بھی زندہ رکھنے اور موت دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ اپنے قول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر ڈالا اور پھانسی کے منتظر شخص کو بخش دیا۔ یوں اِن دو اُمور کو مدِ نظر رکھ کر گمان کر بیٹھا کہ وہ بھی خدا ہے اور خدا کی طرح اعمال و افعال انجام دیتا ہے۔ بحوالہ:
ابن کثیر، حافظ عماد الدین ابی الفداء اسماعیل ابن عمر، البدایۃ والنھایۃ، ج 1 (بیروت، مرکز البحوث والدراسات العربیۃ والاسلامیۃ بدار ھجر، 1417ھ بمطابق 1997ء)، 343

(6)۔ فرعون کی باغیانہ طبیعت کی نشاندہی قرآنِ مجید سمیت دیگر علمی ذخائر میں کی گئی ہے۔ ایک شخص اپنے محدود اختیارات کے بل بوتے پر خدائی دعویٰ کر بیٹھا۔ اللہ نے جو فطرت (عبدیت کی خصلت) عطاء کی تھی وہ فراموش کر گیا اور تاریخ انسانیت میں ایک ایسی شخصیت کے طور پر مشہور ہوا جو اللہ تعالیٰ کی کمالِ صفات اپنے لئے موجبِ حق سمجھتا تھا، یہاں تک کہ سب سے بڑا خدا ہونے کا اعلان بھی کیا۔ انا ربکم الاعلیٰ، القرآن، سورہ نازعات، 24

احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی، ج 1 (مترجم: مولانا اختر فتحپوری)، (کراچی، نفیس اکیڈمی، ندارد)، 53 تا 58

(7)۔ کراروی، نجم الحسن، تاریخ اسلام، ج ا (لاہور، امامیہ کتب خانہ، ندارد)، 177، 418، 419

(8)۔ اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكِرًا وَاِمَّا كَفُورًا
سورۃ الدھر، 3

(9)۔ قال رسول اللہ " اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الاُمَّھَات "
الشیخ محمد، الری شھری، میزانُ الحکمۃ، ج ۱۰ (لبنان، دار الحدیث للطباعۃ والنشر، 2010ء)، 712

(10)۔ ابن ماجہ، ابی عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی، سنن ابن ماجہ، حدیث: 1857، (مترجم: مولانا محمد قاسم امین)، (لاہور، مکتبۃ العلم، ندارد) ص: 21، 22

(11)۔ جدید تعلیم سے مزین بعض خواتین کی تمام تر توانائیاں اسی ایک مدعا کو ثابت کرنے کے لئے صرف ہو رہی ہیں۔ مسلم سماج سمیت پوری دُنیا میں خواتین کا ایک گروہ موجود ہے جن کا ماننا ہے کہ عورت کو حقیقی مقام کی طرف لے جانے کے لئے اُن کے نظریات اور جد وجہد منارۂ نور ہیں۔ جیسا کہ عورت مارچ اور حقوق النساء کے پُر فریب نعرے اس بات کی گواہی کے لئے کافی ہیں۔

(12)۔ ابن کثیر، ابو الفداء عمادُ الدین، البدایۃ والنھایۃ، ج 1، مترجم: پروفیسر کوکب شادانی، (کراچی، نفیس اکیڈمی، 1987ء)، 130

(13)۔ وَيٰٓـاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ،
سورۃ الاعراف، 19

(14)۔ ابن کثیر، حافظ ابو الفداء عماد الدین، البدایۃ والنھایۃ، محولہ بالا، 131، 132

(15)۔ "لوہاروی، عمر فاروق"، عورت کا نماز میں مردوں کی امامت کرنا، مشمولہ: دار العلوم ویب، مورخہ: 6 جون 2005ء،

- "Umer Farooq, Loharvi", Accessed, 13 November, 2021, https://www.darululoom-deoband.com/urdu/articles/
- "بی بی سی اُردو ویب"، عورت کی امامت میں پہلی نماز، مورخہ: 19 مارچ، 2005ء
- November 13, 2021, https://www.bbc.com/urdu/specials/1622_prayer_ny_ms

(16)۔ عن عطاء عن عائشۃ انھا کانت توذن وتقیم وتؤم النساء وتقوم وسطھن
حضرت عطاء حضرت عائشہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ وہ اذان دیتی تھیں، اقامت کہتی تھیں اور عورتوں کو نماز پڑھاتی تھیں اور ان کے درمیان کھڑی ہوتی تھیں۔
النیشاپوری، ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم، المُستدرک علی الصحیحین، ج 1، کتاب الصلوۃ، باب فی فضل الصلوۃ الخمس، رقم الحدیث: 731، (لاہور، شبیر برادرز، 2010ء)، 406

(17)۔ حدثنا عثمان بن الھیثم، حدثنا عوف، عن الحسن، عن ابی بکرۃ، قال: لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم، قال: لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسری، قال: "لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ
بخاری، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، ج6، باب: کتاب النبی الی کسری وقیصر، حدیث: 4425، (ہند، مرکزی جمعیت اہل حدیث)، 43
ہم سے عثمان بن ہیثم نے بیان کیا، کہا ہم سے عوف اعرابی نے بیان کیا، ان سے امام حسن بصری نے، ان سے ابو بکرہ نے بیان کیا کہ جنگ جمل کے موقع پر وہ جملہ میرے کام آ گیا جو میں نے رسول اللہ (ﷺ) سے سنا تھا۔ میں ارادہ کر چکا تھا کہ اصحاب جمل، عائشہؓ اور آپ کے لشکر کے ساتھ شریک ہو کر علی کی فوج سے لڑوں۔ انہوں نے بیان کیا کہ جب نبی کریم (ﷺ) کو معلوم ہوا کہ اہل فارس نے کسریٰ کی لڑکی کو وارث تخت و تاج بنایا ہے تو آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنا حکمران کسی عورت کو بنایا ہو۔

(18)۔ نائن الیون حملوں کے بعد زمینی فضاء جس طرح مکدر ہوئی اُس کے تناظر میں قرار دیا گیا کہ اسلام اور مسلمانوں کا دہشت گردی سے کوئی تعلق ضرور ہے، سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش جونیئر اور دیگر امریکی عہدیداران نے کھلے الفاظ میں اور کہیں اشاروں کنایوں میں اُن دہشت گردانہ حملوں کی نسبت مسلمانوں کی طرف دی۔ اُس وقت (2001ء) کے اخبارات، میڈیائی ادارے اور مطبوعہ مواد اِس قسم کے الزامات سے خالی نہیں ہے۔

(19)۔ سورۃ الحجرات، 13

Bibliography:

1. Al-Nishapori, Abi Abdullah Muhammad ibne Abdullah Al-Hakim, *Al-Mustadrak Alas-Sahihain*, (Lahore, Shabir Brothers), 2010
2. Al-Sheikh Muhammad, Al-rishehri, *Meezan-ul-Hikma*, (Lubnan, Dar-ul-Hadeed Lit-taba'ati Al-Nashri), 2010
3. Ahmed bin abi Yaqoob, *Tareekh-e-Yaqoobi*, (Karachi, Nafees Academy)

4. Accessed, 13 November, 2021, https://www.darululoom-deoband. com/ urdu/ articles/
5. Bokhari, Abu Abdullah Muhammad Ibne Ismail, *Sahi Bokhari*, (Hind, Markazi Jamiat Ahle Hadeeth)
6. Dhelavi, Abdul Haq Mohaddis, *Madarij-un-Nabova*, (Lahore, Shabbir Brothers), 2004
7. Fareed, Professor Dr. Arifa, *Tehzeeb kay us Paar: Asr-e-Hazir kay Masail aur Islami fikar Margribi fikar kay tanazur main*, (Karachi, University of Karachi), 2000
8. Hamdani, *Aain-ul-Quzaat, Gayat-ul-imkan fi drayat-ul-makan*, (Karachi, Maktaba-e-Nadeem), 1984
9. Ibne Kaseer, *Al-bidaya Wal-Nihaya*, (Berut, markaz-ul-bahoos wa dirasat-ul-arabia wal Islamia bidar-ul-hijr), 1997
10. Ibne Maja, Abdullah Muhammad bin Yazeed Al-Qazvini, *Sunan-e-Ibne Maja*, (Lahore, Maktabt-ul-Elam)
11. Karaavi, Najm-ul-Hasan, *Tareekh-e-Isalam*, (Lahore, Imamia Kutub Khana)
12. Loharavi, Umar Farooq, *Aurat ka namaz main mardon ki Imamat karna*, (Karachi, Dar-ul-Uloom web), Dated 6 June, 2005
13. November 13, 2021, https://www.bbc.com/urdu/specials/1622_prayer_ny_ms
14. Shirazi, Sadruddin, *Asfar-e-Arba'a*, (Haidar Abad Dccan, Daruttaba, Jamia Usmania Sarkar-e-Aali), 1944
15. Tirmizi, Abu Essa Muhammad ibne Essa, *Jamia Tarmizi*, (Lahore, Maktabt-ul-Elam)